بلند اقبال ۔۔۔میرے ادیب اور طبیب دوست

ڈاکٹر خالد سہیل (کینیڈا)

بلند اقبال سے میرا غائبانہ تعارف ان دنوں ہوا جب میں نے علامہ اقبالؔ کے بارے میں ایک مضمون ٹورانٹو کی ایک ادبی محفل میں سنایا تھا جس میں میں نے ایک نفسیات کے طالبعلم ہونے کے ناطے ان کی رومانوی زندگی کا نفسیاتی تجزیہ کیا تھا۔ میرا مضمون سن کر وہ لوگ جو علامہ اقبالؔ کے نام کے ساتھ رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں بہت برہم ہوئے اور سنگباری کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ نجانے کس طرح میرا مضمون ٹورانٹو سے اڑتا ہوا ونی پیگ کی ادبی محفلوں میں بلند اقبال تک پہنچا اور انہوں نے نجانے کیا سوچ کر میرے مضمون کو انٹرنیٹ کی وساطت سے اپنے ساتھیوں کو بھیجا۔ بدقسمتی سے وہ سنگ جو مجھ پر گرنے تھے بلند اقبال کے سر پر گرنے لگے اور انہوں نے مجھے بڑی اپنائیت سے ایک خط تحریر کیا جس میں لکھا تھا 'بھائی خالد سہیل! یہ کہنے کی شاید قطعی ضرورت نہیں کہ اقبالؔ پر آپ کا مضمون 'علامہ اقبال ۔۔ ایک محبوبہ' تین بیویاں' چار شادیاں' کئی حوالوں سے چونکا دینے والا تھا'

بلند اقبال بخوبی واقف تھے کہ اس مضمون سے وہ لوگ بہت پریشان تھے جو انہیں شاعر کی بجائے ایک ولی اللہ کا رتبہ دینا چاہتے تھے۔ اس لئے انہوں نے خط میں لکھا 'اس علم سے ایک نقصان عام قاری کے تصورِ اقبال کو پہنچا۔ یہاں تصورِ اقبال سے مراد ان کی ذاتی زندگی کے تصور سے ہے جو خود ان کے افکار کی روشنی میں انجانے طور پر ان کے بارے میں بن جاتا ہے اور ظاہر ہے فائدہ بھی اس illusion کے ٹوٹ جانے سے ہوا (جو یقیناً خاصا تکلیف دہ تھا) کہ بڑی شخصیات اپنی نجی زندگی میں عام انسانی واقعات سے درپیش رہتی ہیں اور عام انداز ہی سے برتتی ہیں۔ یہ احساس قاری کے لئے کسی حد تک ذہنی بلوغت کا سبب بنا۔ مگر یہ ایک مشکل مرحلہ تھا کیونکہ اقبال کی شخصیت سے جذباتی وابستگی کی بنا پر یہ موضوع سخت مخالفت کے سپرد ہو گیا'۔

بلند اقبال کا محبت نامہ پڑھ کر مجھے بھی ان سے رابطہ قائم کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ انٹرنیٹ پر ہماری خط و کتابت ہوئی تو پتہ چلا کہ وہ ایک طبیب بھی ہیں اور ایک ادیب بھی۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں ان کے روشن خیال والد حمایت علی شاعرؔ کی شاعری کا اپنے چچا عارفؔ عبدالمتین کی شاعری کی طرح بہت مداح ہوں۔ چنانچہ ایک دفعہ جب بلند اقبال کے ٹورانٹو میں آنے کی خبر مجھے میرے نہایت ہی عزیز ناول نگار اور موسیقار دوست شاب نقوی نے دی تو میں نے انہیں 'درویشوں کے ڈیرے' کی محفل میں بلایا۔ اس محفل میں ان سے ملاقات کی کہانی خود بلند اقبال کی زبانی سنیے۔ لکھتے ہیں

'اورورا' انٹاریو میں ایک صبح جیسی شام ۔۔۔ درویشوں کے ڈیرے پر

''بس ایک ہمک سی تھی جو تنی ہوئی لگاموں پر لہرائی اور چھ گھوڑوں کی بگھی بیریBarrie اور ونی پیگ winnipeg کے دونوں مسافر درویشوں (ڈاکٹر نوشاد نورانی اور ڈاکٹر بلند اقبال) کو لے کر مسی ساگا سے اورورا کی جانب سرپٹ

دوڑنے لگی۔ پکی سڑک کے دونوں جانب پھیلے سرسبز میدانوں میں سرسوں کے نازک پھول خنک ہوا کے جھونکوں سے اٹھکیلیاں کرر ہے تھے۔ آسمانوں پر بادلوں کے نٹ کھٹ غول شرارتی نگاہوں سے بگھی کے ساتھ دھوپ چھاؤں کا کھیل کھیل رہے تھے۔ دور کہیں ارورا کی بستی میں دس پندرہ مہربان درویش اپنے میزبان درویشوں (زہرا نقوی اور عسکری نقوی) کی خوبصورت سی کٹیا میں آتشدان کے گرد ایک عالمِ بے خودی میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کٹیا میں چاروں طرف مصالحے دار چاولوں اور دال' گندم' جوٗ سے بنے مزیدار پکوان کی خوشبو مہک رہی تھی۔ بند بوتلوں میں بھری ہوئی مشروبات درویشوں کے پیاسے ہونٹوں کی شدت کو محسوس کر کے چپکے چپکے مچل رہی تھیں۔ دیواروں پر لٹکے آرٹ کے ہوشربا نمونے اپنی بارگاہ میں جھکے درویشوں کے دھڑکتے دلوں کی دھمک میں تہنیتیں وصول کرر ہے تھے۔

فرش پر بچھا ہوا ایرانی غالیچہ آنے والے مہمان درویشوں کے وجود کی نرمی کو خود میں سمیٹنے کے لئے بے تاب مگر انجان پڑا تھا۔ اچانک کٹیا کی خاموش فضا دروازوں کے باہر کے گھوڑوں کی ہنہناہٹ سے مل کر جلترنگ بجنے لگی۔

ایک ایک کر کے تمام درویش عالمِ بے خودی سے باہر آنے لگے۔ بیری اور ونی پیگ سے آئے ہوئے درویش تمام درویشوں سے بغل گیر ہوئے اور پھر رسمی تعارف کے بعد اپنی اپنی مخصوص نشستوں پر بیٹھ گئے۔''

بلند اقبال نے اس ملاقات کو کس خوبصورتی سے تحریر کیا ہے اس سے آپ کو ان کی انشا پردازی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

درویشوں کے ڈیرے پر بلند اقبال کو احساس ہوا کہ وہ ایک ایسی محفل میں آ گئے ہیں جہاں ہر ادیب' شاعر' فلسفی' اور سامع کو پورا پورا حق حاصل ہے کہ وہ اپنی رائے کا کھلم کھلا اظہار کرے۔ باقی درویش اس کی رائے سے اختلاف تو کر سکتے ہیں لیکن اس سے بولنے کا حق نہیں چھین سکتے۔ اس ملاقات نے بلند اقبال کا انٹاریو کے دوستوں سے ایک خوشگوار تعلق قائم کیا جس کی شیرینی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھتی جا رہی ہے۔

جب میں نے بلند اقبال کے غیر روایتی افسانے' افسانچے اور تخلیقی فن پارے سنے اور پڑھے تو مجھے احساس ہوا کہ ان کا تعلق بھی سعادت حسن منٹو عصمت چغتائی'' جوش ملیح آبادی اور مصطفیٰ زیدی کے قبیلے سے ہے جن پر اردو کے روایتی ادیب اور قاری اس لئے پتھر پھینکتے رہے ہیں کیونکہ انہیں عوام کو آئینہ دکھانے' پورے انسان کی کہانی سنانے اور مشرقی روایات کو چیلنج کرنے کی عادت تھی۔ ان مشرقی روایات میں جنسی روایات بھی شامل ہیں اور مذہبی روایات بھی۔

منٹو سے جب پوچھا گیا کہ آپ عام عورتوں کی بجائے طوائفوں کے بارے میں زیادہ کیوں لکھتے ہیں تو وہ کہنے لگے کہ ہر عورت ویشیا نہیں ہوتی لیکن ہر ویشیا عورت ہوتی ہے۔ ہندوستان کے سادھو شاعر کبیر داس نے کہا تھا کہ ہر انسان کو سمندر میں لاکھوں پانی کے قطرے نظر آتے ہیں لیکن ایک صاحبِ نظر شاعر اور ادیب کو ہی ہر پانی کے قطرے میں سمندر دکھائی دیتا ہے اور بلند اقبال بھی ایک ایسے ہی صاحبِ نظر ادیب اور طبیب ہیں۔ جب وہ ایک کردار پر اپنی توجہ مرکوز کرتے ہیں تو انہیں ایک انسان میں پوری انسانیت دکھائی دیتی ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ ادیب بھی معاشرے کا طبیب ہوتا ہے اور ان کے معاشرتی اور سماجی ناسوروں کا علاج کرتا ہے۔

ایک نفسیات کے طالبعلم ہونے کے ناطے میں ان کے افسانے بڑے شوق سے پڑھتا ہوں کیونکہ وہ ایسے جنسی اور نفسیاتی مسائل کو اپنا موضوع بناتے ہیں جنہیں باقی ادیب چھوتے بھی ڈرتے ہیں۔ میری نگاہ میں ان میں ایک ہیوی ویٹ heavyweight ادیب بننے کی پوری صلاحیت موجود ہے۔

بلند اقبال کا افسانہ 'یہ کیسی بے وفائی ہے' پڑھ کر عصمت چغتائی کے افسانے 'لحاف' اور 'گدھ' کو پڑھ کر منٹو کے افسانے 'کالی شلوار' کی یاد تازہ ہوگئی۔ بلند اقبال نے اپنے افسانوں میں sexual abuse کو بھی اپنا موضوع بنایا ہے چاہے وہ بچوں کے ساتھ ہو یا عورتوں کے ساتھ۔ وہ جانتے ہیں کہ جنسی مظالم کس طرح انسانی ذہن اور شخصیت کو مجروح کرتے ہیں۔ 'پہلا پیار' میں وہ لکھتے ہیں 'ماسٹر شریف تو دو سال بعد اسکول چھوڑ گئے مگر رحیم داد کی روح کو عمر بھر ڈسنے کے لئے رینگتے سانپ چھوڑ گئے'

منٹو اور عصمت چغتائی کی طرح بلند اقبال بھی جانتے ہیں کہ وہ ایک منافق معاشرے میں پیدا ہوئے۔ وہ اس منافقت کو اپنے افسانوں میں بڑے تخلیقی انداز سے پیش کرتے ہیں۔ مشرق کا وہی مرد جو بظاہر ایک سائنس اور فلسفے کا آزاد خیال پرستار دکھائی دیتا ہے در پردہ گناہ وثواب میں الجھا رہتا ہے جیسے اس کے اندر ایک لمبی داڑھی والا مولوی چھپا ہو۔ بلند اقبال کا ایک ایسا ہی کردار ان کے افسانے 'سہاگ رات' میں جب حجلۂ عروسی میں جاتا ہے تو اپنی دلہن سے کہتا ہے 'محترمہ۔۔ آپ دو رکعت نماز پڑھ لیجئے کہ سنتِ رسول ہے اور میں بھی غسل کر کے آتا ہوں کہ مباشرت سے پہلے واجب ہے **اور**۔۔ ہاں' انہوں نے ایک طائرانہ نظر سے روشنی کی طرف دیکھا اور کہا 'یہ روشنی گل کر دو' یہ مکروہ ہے' کچھ ہی دیر میں باتھ روم سے آنے والی پانی کی گرنے کی آوازیں اور اس کی آنکھوں میں بہتا ہوا کاجل اسے مذاہب کے روحانی اور سماجی ملاپ سے پیدا ہونے والی سہاگ رات کا مطلب سمجھانے لگے'

بلند اقبال کے افسانوں پر اعتراضات کی ایک وجہ یہ ہے کہ وہ خدا اور مذہب کے روایتی تصورات کو چیلنج کرتے ہیں اور قارئین کو نئے انداز سے سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ اس چیلنج کا ایک تخلیقی اظہار ان کے افسانے 'شکوہ' کے ایک فنکار کردار کے حوالے سے ہوتا ہے۔ بلند اقبال لکھتے ہیں 'اس رات وہ سفید بالوں والا بوڑھا آرٹسٹ اپنی جاءِ نماز پر دیر تک روتا رہا اور کسی بلبلاتے ہوئے بچے کی طرح اپنے خداوند تعالیٰ سے گڑگڑا کر فریاد کرتا رہا' اور پوچھتا رہا 'میری تخلیق تو آرٹ گیلری میں ایک بار بکتی ہے اور تمہاری تخلیق یہاں دنیا میں بار بار۔۔۔'

جنسی' مذہبی اور نفسیاتی مسائل کے ساتھ ساتھ بلند اقبال نے سماجی مسائل پر بھی قلم اٹھایا ہے جس کی ایک عمدہ مثال شاہ دولہ کے چوہے ہیں۔ بلند اقبال ہم سے پوچھتے ہیں کہ یہ کیونکر ممکن ہے کہ اکیسویں صدی میں بھی دورِ جاہلیت کی طرح معصوم بچوں کو لوہے کی ایسی ٹوپیاں پہنا دی جاتی ہیں جن سے ان کے دماغ کی نشوونما رک جاتی ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ وہ ظلم اور جبر صرف **شاہ دولہ کے** چوہوں تک ہی محدود بلکہ وہ ٹوپیاں ان سماجی اور مذہبی روایات کا استعارہ ہیں جن کی اندھے ایمان کی ٹوپیاں ماں باپ اپنے معصوم بچوں کو پہنا دیتے ہیں۔ بچے ساری عمر منطقی' تخلیقی اور تنقیدی سوچ سے محروم رہ جاتے ہیں اور عمر بھر جسمانی طور پر بالغ ہونے کے باوجود ذہنی طور پر نابالغ رہتے ہیں۔ بلند اقبال لکھتے ہیں 'بے جا پابندیاں نشوونما کی راہ میں رکاوٹ ہی ہوا کرتی ہیں۔۔۔ پھولوں کو کھلنے کے لئے تازہ اور آزاد ہوا ہی کی ضرورت ہوتی ہے' ص ٦٦

بلند اقبال ایک طبیب اور ادیب ہونے کے ناطے جانتے ہیں کہ صحتمند معاشرہ صرف اس وقت ارتقا کی راہوں پر گامزن ہوتا ہے جب ان کی جسمانی، ذہنی اور تخلیقی نشونما ہوتی رہے اور ایک ادیب اور شاعر کا یہ سماجی فریضہ ہے کہ وہ ان عوامل کی نشاندہی کرے جو انفرادی اور سماجی ارتقا کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں۔

بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ جب بلند اقبال کے افسانے محفلوں میں پیش کیے جاتے ہیں تو ان پر ادبی اور فنی تنقید سے زیادہ سماجی، ثقافتی اور مذہبی تنقید ہوتی ہے۔ چونکہ وہ روایتی انداز سے روایتی موضوعات کے بارے میں نہیں لکھتے اس لئے روایتی قارئین پریشان ہو جاتے ہیں۔ جہاں موضوعات **themes** کے حوالے سے بلند اقبال کا منٹو کے قبیلے سے تعلق ہے ہیئت **form** کے حوالے سے ان کا تعلق انور سجاد اور مظہرالاسلام جیسے جدید افسانہ نگاروں سے ہے جن کے افسانوں پر بعض دفعہ نثری نظموں اور انشائیوں کا گمان بھی ہوتا ہے۔ جوگندر پال نے بھی کئی افسانے اسی نوعیت کے لکھے ہیں جن میں ایک صفحے ہی میں ایک پوری کہانی بیان کر دی جاتی ہے۔ ایسے افسانچوں سے محظوظ ہونے کے لئے قاری کو تخلیقی طور پر **involve** ہونا پڑتا ہے اور بہت سی تفاصیل کو اپنی **imagination** سے پر کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے ایسے افسانے ان آرام طلب اور سست قارئین کے لئے نہیں ہیں جنہیں ادیب سارا کھانا پکا پکایا پیش کرتا ہے۔ یہ علیحدہ بات کہ بعض دفعہ ایسے افسانوں کو ابلاغ کے مسائل پیش آتے ہیں کیونکہ بعض قارئین ادیب سے تخلیقی رشتہ قائم نہیں کر پاتے۔ لیکن بلند اقبال جیسے جدید افسانہ نگاروں کو امید ہے کہ جوں جوں ادیب اور قاری کے ادبی ذوق کی پرورش ہوگی وہ دونوں ابلاغ کا ایک نیا اور غیر روایتی پل تعمیر کرنے میں کامیاب ہوں گے۔ ادیب اور قاری کا رشتہ عمر بھر کا رشتہ ہوتا ہے اور ہر ادیب اپنے مزاج کے قاری پیدا کرتا ہے۔ مجھے پوری امید ہے کہ جوں جوں بلند اقبال کے افسانے زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچیں گے ان کے قارئین کا حلقہ وسیع تر ہوتا جائے گا۔

میں بلند اقبال کو ان کی پہلوٹی کے بچے۔۔۔ پہلی کتاب۔۔۔ پہلے شہ پارے۔۔۔ 'فرشتے کے آنسو' کی پیدائش پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ امید ہے وہ اس طرح کے اور بھی بہت سے بچے پیدا کریں گے۔ اور ان کتابوں کو اگلی نسل کے بچوں کو پڑھنے کا موقع ملے گا۔ ان کے افسانوں سے بچوں کے سروں سے اندھے ایمان اور بوسیدہ روایات کے لوہے کی ٹوپیاں ہٹیں گی اور انہیں تازہ خیالات اور جدید نظریات کی تازہ ہوا میں سانس لینے کا موقع ملے گا۔ میرے دو شعر ہیں

حدیثِ کربِ نہاں اب کرے بیاں کوئی ۔۔۔ سنائے جبرِ مسلسل کی داستاں کوئی

ہمارے بچوں کی سوچوں پہ کب سے پہرے ہیں ۔۔۔ کہاں سے آئے گا آزاد نوجواں کوئی

مجھے پوری امید ہے کہ بلند اقبال کے فن پارے نوجوان ذہنوں پر دستک دے کر ان کے بند کواڑ کھولتے رہیں گے۔

ایک فلاسفر نے کہا تھا

Human minds are like parachutes, they work only when they are open

خالد سہیل اپریل ۲۰۰۸ء